غلام گردش

یہ ذاتیات پر مبنی جنگ ہے

اپوزیشن کا بنیادی کام حد درجہ مشکل ہوتا ہے۔ جمہوری نظام میں سیاسی اپوزیشن، حکومتی جماعت کی کوتاہیوں پر عقاب کی نظر رکھتی ہے۔ مگر معاملہ یہاں ہرگز ہرگز نہیں رکتا۔ حزب اختلاف کو حکومتی غلطیوں کی درستگی کے لئے ایک جامع منصوبہ بھی عوام کے سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ سرکار کی خامیاں لوگوں کے سامنے لانا ایک راست بات ہے۔ مگر ان تمام مسائل کا حل دینا اس سے بھی بڑا اور دقیق کام ہوتا ہے۔ مغربی جمہوری ممالک میں حزب اختلاف کے لوگ صرف طعنہ زنی اور دشنام درازی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ مختلف تھنک ٹینکس کے ساتھ مل کر تمام مسائل کا جامع حل نکالتے ہیں۔ جسے پارلیمنٹ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی بہتر منصوبہ بندی، بڑی سے بڑی جمہوری حکومت کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ وصف بھی صرف مہذب ممالک کے پختہ جمہوری نظاموں میں نظر آتا ہے۔ اور اس طرح تمام سیاسی قوتیں مل کر صرف ایک نکتہ پر کام کرتی ہیں۔ اور وہ ہے عوام کی بھلائی اور ان کی دیکھ بھال۔ ان کو بنیادی ضرورتوں کو مہیا کرنے کا بہترین سسٹم ترتیب دینا۔ حد درجہ پیچیدہ بات کو سادہ سے نکتے میں عرض کر رہا ہوں۔ بغیر کسی لفاظی کے اگر کسی بھی جمہوریت کا جوہری مقصد بتانا ہو، تو وہ صرف ایک ہے۔ کہ عام لوگوں کی زندگیوں کو کیسے آسان سے آسان تر بنایا جائے۔ تیسری دنیا میں اول تو جمہوریت کو صرف رنگ روغن کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ مہذب رنگ کا غازہ ملک کے ابتر نظام پر لگا کر اسے جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔ افریقہ کے اکثر ممالک، وسطی امریکہ کی ریاستیں اور ہمارے جیسے ممالک صرف اور صرف جمہوریت کا نام استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیڈران میں جمہوری اقدار کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور دوسرا یہ اس خوبصورت نام کے پیچھے صرف اور صرف ناجائز دولت کمانے کا ایک خوفناک دھندا چل رہا ہوتا ہے۔

خان صاحب نے وزیراعظم نواز شریف کے خلاف جس طرح کی زبان استعمال کی اور اپنے قرابت داروں کو بھی اخلاق سے گری ہوئی تقاریر کرنے کی عادت ڈال دی۔ وہ اس موجودہ سیاسی بحران کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔ یہ نہیں کہ خان صاحب سے پہلے ساست دان مخالفین کے متعلق غیر اخلاقی زبان استعمال نہیں

کرتے تھے۔ بالکل کرتے تھے۔ مسلم لیگ ن کے اکابرین بینظیر بھٹو کے متعلق جتنے شرم آمیز جملے اچھالتے تھے' وہ آج بھی سنتے ہوئے سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ مگر اس گستاخانہ نکتہ چینی کو بڑھاوا گذشتہ پانچ چھ برس میں کچھ زیادہ ملا ہے۔ چلیے' اس نکتہ کو بھی گرد میں دبا دیجئے۔ موجودہ سیاسی حالات پر غور فرمایئے۔ عدم اعتماد کی تحریک کے متعلق بات کیجئے۔ کہا جا رہا ہے کہ عدم اعتماد کی تحریک ایک جمہوری عمل ہے۔ یہ آئین کے مطابق بالکل درست بات ہے۔ مگر جس ملک کے ایک کونے میں بھی قانون اور آئین کی عملداری نہ ہو۔ جہاں تمام معاملات ذاتی پسند اور ناپسند کے حساب سے چلتے ہوں' جہاں مفادات کا حصول' قانون کو نافذ کرنے سے زیادہ اہم ہو۔ وہاں یہ آئینی اصول حد درجہ دھندلا جاتا ہے۔ اور اس کے پیچھے چھپے' شخصی مقاصد سامنے آنے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی بعینہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اور پھر یہ کہ ذاتی مفاد کی تکمیل کے دھوئیں کی آڑ میں ایک سادہ سا تاثر دیا جا رہا ہے کہ تحریک عدم اعتماد ایک آئینی حل ہے۔ چلیئے۔ اس کو مان بھی لیا جائے تو مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی میں تو دستخط شدہ معاہدے موجود ہیں۔ کہ کسی بھی جمہوری طور پر منتخب حکومت کو گرایا نہیں جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ لوگوں کی نظروں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھا۔ پرانے سیاسی حریف ایک دوسرے کو فنا کرنے کے لئے ہر غیر اخلاقی حربہ استعمال کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ بہر حال نواز شریف اور زرداری کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک تیسرا سیاسی فریق انہیں پچھاڑ کر حکومت حاصل کر لے گا۔ وہ تیسرا فریق انہیں کے آزمائے ہوئے گر استعمال کر کے ملک کا وزیر اعظم بن جائے گا۔ دونوں پرانی سیاسی طاقتیں حکومت کرنے کو اپنا خاندانی اور ذاتی حق سمجھتی تھیں اور آج بھی یہی ذہنی سوچ ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ایک تیسرا طفل مکتب ان کو سیاسی میدان میں خاک کیسے چٹوا گیا۔ یہ وہ ذہنی ساخت ہے جس میں ہر چیز گندھی ہوئی ہے۔ اور اب اس خاندانی سوچ کا بھرپور مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔

اس ملک میں کوئی ایک سیاسی لیڈر' مکمل قانونی طریقے سے الیکشن جیت کر نہیں آیا۔ نواز شریف نے آج تک کسی بھی الیکشن کی مہم اسٹیبلشمنٹ کی مرضی اور حمایت کے بغیر نہیں سر کی۔ یہی حال پیپلز پارٹی کا ہے۔ اندرون خانہ حالات دیکھئے تو تمام سیاسی عناصر صرف میرٹ یا شفافیت کی بدولت قوم کی رہنمائی کا حق حاصل نہیں کر پائے۔ ہر ایک نے ریاستی حلقوں کی آشیرباد سے اقتدار کی ہما پنجرے میں قید کر کے ملک کو مسخر کیا۔ اور پھر

جمہوریت جموریت کا کھیل شروع کیا گیا۔ ناقابل تردید حقائق موجود ہیں' جو ملک میں موجود تمام سیاسی رہنماؤں کی اصل طاقت یعنی ریاستی اداروں کی قوت کو اجاگر کرتے ہیں۔ عمران خان نے بھی اقتدار میں آنے کے لئے یہی راستہ چنا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ 2018ء میں حسب روایت' تمام طاقتور فریق' خان کی پشت پر کھڑے تھے۔ معاملہ صرف الیکشن جیتنے تک رہتا تو ٹھیک تھا۔ مگر عمران خان کی متلون مزاجی اور غیر سنجیدگی سے ان کے تمام دوست ناراض ہونے لگے۔ خان صاحب کو اقتدار کے اصل محافظ تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر اختیار کے اصل مالک یعنی بیورکریٹس نے انہیں بالکل قبول نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ عمران خان کے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ ایک خوفناک حکمت عملی کے ذریعے پرانے گھاگھ بابو' خان صاحب کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ دراصل وہی ان کے اصل خیر خواہ ہیں۔ اور ہاں' باقی سارے افسر نالائق اور کرپٹ ہیں۔ اس گروہ نے خان صاحب کو اس طرح گھیرا کہ ان کا سیاسی مستقبل برباد ہو گیا۔ ان کے چند اچھے کام بھی حد درجہ برے لگنے لگے۔ اور آج یہ صورت حال ہے کہ خان صاحب کی مشکلات اس درجہ بڑھ چکی ہیں کہ انکا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے وہ تقریباً گر پڑے ہیں۔ وہ سرکاری گروہ' جو ان کے مخالفین کا وفادار ہے۔ آج بھی اقتدار میں ہے۔ دبا کر پیسے لے رہا ہے۔ موج کر رہا ہے اور خان صاحب صرف اور صرف تقاریر کرنے پر لگا دیئے گئے ہیں۔ آپ کو وہ گزارشات کر رہا ہوں۔ جو سسٹم میں کام کرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ ریاستی حلقے بہت دیر تک صبر کرتے رہے۔ خان صاحب کو سمجھاتے رہے۔ مثلاً پنجاب کے وزیراعلیٰ کو تبدیل کرنے کے لئے انہیں متعدد بار مشورہ دیا گیا۔ مگر خان صاحب نے سب سے بڑے صوبے میں اپنی سیاست کو برباد کر ڈالا۔ مگر ضروری تصیح نہیں کی۔ خیر اب تو پانی سر سے گزر چکا ہے۔ لہٰذا اب صائب مشورے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

خان صاحب کی سیاسی غلطیوں پر اپوزیشن نے شروع میں اس لئے توجہ نہیں دی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے مالی مفادات کو حکومت نقصان نہیں پہنچائے گی۔ یہ معاملہ بس تقاریر تک ہی محدود رہے گا۔ مگر جب یہ سلسلہ بڑھ گیا تو پھر بھرپور طریقے سے روایتی سازشی کام شروع ہوا۔ چھوٹے میاں صاحب نے ریاستی حلقوں کو یقین دلانا شروع کیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی سے مختلف ہیں۔ اور بھرپور تابعداری کرتے رہیں گے۔ یہ وہ فکری بنیاد ہے جس سے معاملہ آگے بڑھ رہا ہے۔ چھوٹے میاں صاحب جس چیز کو جمہوریت قرار دیتے ہیں وہ دراصل اصلی

جمہوریت کی کاربن کاپی ہے۔مگر نقلی جمہوریت کے آنے سے انہیں کوئی غرض نہیں کیونکہ اقتدار میں آنے کے بعد ہی وہ اتنے مؤثر ہوں گے کہ اپنے اوپر دائر شدہ کرپشن کیسوں پر اثر انداز ہوسکیں۔لہٰذا یہ سنہری موقعہ ہے کہ پرانی رسم کے تحت اقتدار میں آ کر اپنی دولت کو محفوظ کیا جائے۔ جہاں تک فضل الرحمٰن صاحب کا تعلق ہے۔تو وہ ایک مذہبی فرقے کے رہنما ہیں جس کے ہاتھ میں مدارس کی طاقت ہے اور اس قوت سے ریاستی ادارے بھی خائف ہیں۔ ابھی تک پاکستان میں کوئی ایسی حکومت نہیں آئی جو مذہبی طبقہ کا سیاسی مقابلہ کر سکے۔ مولانا صاحب سیاست کے میدان سے باہر تھے۔مگر انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی نظام کا اہم پرزہ ثابت کر ڈالا۔کوئی سیاسی رہنما ان پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی ان کی معاونت کا محتاج ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

چلیے۔تحریک عدم اعتماد کامیاب ہو جاتی ہے اور اپوزیشن کا کوئی بندہ وزیراعظم بن جاتا ہے۔ پر ذرا بتائیے تو سہی۔ وہ پٹرول کی قیمت عالمی منڈی سے خرید کر مقامی مارکیٹ میں کیسے سستا کرے گا۔ وہ بین الاقوامی مہنگائی کے رجہان کو پاکستان میں آنے سے کیسے روک پائے گا۔ وہ آئی ایم ایف کے در پر جانے سے کیونکر انکار کرے گا۔ وہ مزید قرضے لینے سے کیسے مفر حاصل کرے گا۔ درستگی کے لئے اس کا کیا منصوبہ ہوگا۔اس طرح کی کوئی جامع منصوبہ بندی کم از کم مسلم لیگ ن یا پیپلز پارٹی نے آج تک آشکارہ نہیں کی۔ان تمام کی غیر موجودگی میں اگر حکومت تبدیل بھی ہوگئی تو عوام کی بدقسمتی جوں کی توں رہے گی۔ یہ سیاست نہیں، چند لوگوں کی ذاتی لڑائی ہے۔اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ یہ تو قومی سیاست ہے؟